ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.5,Issue No.2(2023)
(July to September)

فکرِ اقبال کی آفاقی حیثیت: عصری تقاضوں کے آئینے میں

The intellectual legacy of Iqbal:in the context of contemporary demands

ڈاکٹر محمد امان اللہ خان
ریسورس پرسن (اُردو) علّامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (معلّمِ شعبہ پنجاب سکول ایجوکیشن)
ڈاکٹر خرم یاسین
لیکچرار شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج وویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر امتیاز حسین
ریسورس پرسن (اُردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، (معلّمِ شعبہ پنجاب سکول ایجوکیشن)

Dr. Muhammad Aman Ullah Khan
Resource Person (Urdu) AIOU Islamabad،Punjab School Education Department
Dr. Khuram Yaseen
Lecturer, Govt. College Women University, Sialkot
Dr. Imtiaz Hussain
Resource Person (Urdu) AIOU Islamabad،Punjab School Education Department

Abstract:
The centenary of Allama Iqbal's death is just a few years away, but even today, his poetry is read with the same fervor. He has expressed his thoughts on various theories, such as: What is life, who deserves the kingdom, what is jihad, the true believer, the concept of love, the concept of selfhood, and about democracy and monarchy. What he wrote and said has brought him towards the universality of spirituality in the direction of aesthetics and the contemporary era, emphasizing that aesthetics and contemporary spirituality are two sides of the same coin. Iqbal's dynamic and philosophical perception of life and the times connects him on one hand with eternity, while on the other, it compels him to critically assess the cultural and intellectual situation of his era. In essence, Iqbal is a man of the world who transcends the boundaries of race, time, and geography. Just three months before his death, in his message for the New Year, he expressed sentiments that reflect his profound love for humanity and intense aversion to imperialism-

Keywords: intellectual legacy, contemporary demands, Colonialism, British Rule,Theory of Selflessness

حکیم الامّت، امام العصر، مجدد عصر، نباضِ زمانہ، حسّان الہند، مفکر ملت اسلامیہ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے بے مثال کلام سے ایمان افروز اور فکر اجتہاد کے سبب کل مسلمین خصوصاً مسلمانانِ ہند کو جس طرح خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور گری ہوئی انسانیت کو آسمان کی بلندیوں تک دوبارہ عروج دینے میں جو کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دیکھا جائے تو ہر عالم نہ تو شاعر ہوتا ہے اور نہ ہی ہر شاعر مفکر ہوتا ہے۔ اقبالؒ اپنے کلام کے ہر شعر میں زندگی کا پیغام ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے اور ان کی

شاعری کا مرکز انسانی فضیلت کی تفسیر و تعبیر ہے اور اس تفسیر و تعبیر کی بنیاد کلامِ الٰہی اور فرامینِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔ شاعرِ مشرق ہمہ جہت شخصیت کے حامل فرد تھے اور ان کا کلام فکری حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔

۹۔ نومبر ۱۸۷۷ء کو ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والا مدبر و مفکر اور توانا لہجے کا شاعر علامہ محمد اقبال نے ساری زندگی امت مسلمہ کی رہ نمائی کے لیے اپنی بصیرت کا بھرپور استعمال کیا۔ فکر اقبال میں محکوم اقوام خاص ہندوستانی قوم کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف شدید رد عمل ملتا ہے۔ وہ مغرب پرستی کرنے والے افراد سے انتہائی بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دور جب مغربی تہذیب، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، اقتصادی، مذہبی، اخلاقی اور معاشی میدانوں میں دل و دماغ پر چھائے جا رہی تھی اس دور میں اقبال نے مغربی تہذیب کے کم زور پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے اسلامی نظریات فکر کی ترویج اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے اور اسلامی فکر اور عمل کو برتر ثابت کرنے میں اپنے تمام تر اصول و ضوابط اور عملی اور عملی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا فرض ادا کیا۔ اقبال بڑے واضح الفاظ میں پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ ذہنی و فکری طور پر مرعوب طبقہ ہر گز مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی و علمی و عملی فکر کی راہ نمائی کا اہل نہیں ہے۔ یہ اہلیت مسلم معاشرے میں فکری ارتداد کا باعث بن چکی ہے۔ ایسا طبقہ ذاتی مفادات کی خاطر قومی مفادات کا سودا کرتا نظر آتا ہے۔ اسی طبقے کے سبب نو آبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔

نو آبادکاری کا یہ نظام ممکن ہی نہ تھا کہ مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر چلتا۔ اقبال بھی لارڈ میکالے کی دی ہوئی تعلیمی پالیسی پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں وہ جانتے تھے کہ غلام جسمانی ہوں یا ذہنی، معاشرتی و معاشی ہوں یا تہذیبی و ثقافتی، علمی غلام ہوں یا عملی فکری ہوں یا مذہبی و اخلاقی، غلام کی ہمیشہ اپنی سوچ نہیں ہوتی وہ ہمیشہ اپنے آقا کی سوچ اور دماغ سے سوچتا ہے۔ ذاتی مفادات کی خاطر استعماری ہتھکنڈوں اور استعماری مفادات کو ترجیح دینے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ملک و ملت کو بھی داؤ لگا دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غلاموں کی بصیرت سے پناہ مانگتے ہیں اور ہمیشہ مرد حُر کی تمنا اور آرزو کرتے نظر آتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے والے فنون و علوم اور فکر و لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نظر میں مشکوک ہے اور انھی فنون کے تحت تخلیق شدہ ادب، مصوری سنگ تراشی وغیرہ بھی مشکوک ٹھہرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فنون استعماریت کے نظام کے پروردہ حاکموں، مفکروں، ادیبوں اور دانش وروں کی سوچ کی عکاسی ہوتا ہے۔ اقبال نے غلامی کو ذوق حسن زیبائی سے محرومی کا دوسرا نام دیا ہے۔ ان کے نزدیک غلامی انسان کو کند ذہن بنا کر حسن لطافت سے محروم کر دیتی ہے۔ غلام کے باطن سے سوائے بے دلی، خستہ حالی اور ناتوانی کے کچھ نہیں ملتا۔

فکر اقبال اور رومیؒ

یوں تو فکر انسانی میں بیسیوں ایسے دبستان نظر آتے ہیں جن کے فکری نظام ایک دوسرے سے متصادم اور متعارض ہیں مگر جزئیات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو زندگی کے باب میں دو نقطہ نظر ایسے ہیں جو ہر زمانے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی قنوطیت پسند اور رجائیت پسند۔ اقلیم شعر و فکر میں اس دوسرے نقطہ نظر کے دو نہایت پر جوش اور انقلاب آفریں علمبردار رومی اور اقبال کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں ماضی کے دقیقہ رس، شاہد و ناقد، حال کے ہوش مند ناظر اور مستقبل نقش گر ہیں۔ دونوں کی شخصیتوں میں ان تینوں زمانوں کا ایک ایسا حیران کن اجتماع ہے کہ تاریخ شعر انسانی میں اس کی مثالیں کمیاب ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے مضمون "اقبالؒ اور رومیؒ" میں رقم طراز ہیں:

"دونوں کا شعری و فکری سرمایہ اس پریشان کن فکری سوال کا جواب مہیا کرتا ہے کہ مادہ و معنی میں کس طرح اتحاد پیدا کر کے اسے ایک نامیاتی وحدت کی شکل دی جائے اور کس طرح موجود کو متغیر کر کے نوعِ انسانی کو آسودہ حال اور اس کے مستقبل کو روشن اور محفوظ بنایا جا سکے۔ کس طرح نزول کا عروج سے اور پستی کا بلندی سے رشتہ جوڑ کر آدمی کو انسان میں بدلا جا سکے اور اس کا ذاتِ حق سے مستحکم اور ناقابلِ شکست رشتہ قائم کیا جا سکے۔"(۱)

اقبال کے شعری اور نثری سرمائے کو کلیتہً نگاہ میں رکھا جائے تو ان کے یہاں متعدد فارسی شعرا اور ادبا سے ربطِ فکری کے شواہد ملتے ہیں لیکن ان سب میں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جن کے ساتھ ان کا عمر بھر کا پیمانِ عشق اور اتحادِ نظر دکھائی دیتا ہے اور وہ شخصیت ہے جلال الدین رومیؒ کی۔ اپنے اردو اور فارسی کلام میں رومیؒ کا نہایت تسلسل سے ذکر ملتا ہے۔ ان کی پہلی شعری تصنیف "اسرارِ خودی" سے لے کر آخری شعری مجموعہ "ارمغانِ حجاز" تک رومی کا تواتر سے تذکرہ ملتا ہے۔ اپنی کتاب "شذراتِ اقبال" یعنی Stray Reflection سے لے کر اپنے سات انگریزی خطبات تک ہر جگہ رومی کا تذکرہ ہے اور نہایت والہانہ پن سے ان کی فکر سے خود کو وابستہ کر کے اپنے عہد کے آشوب پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اپنی متفرق یادداشتوں پر مبنی کتاب "اسٹرے ریفلیکشنز" (نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن 1992ء) میں اقبال نے دو مقامات پر رومی کا ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ نہایت والہانہ پن سے رومی کو غیر معمولی نکتہ آفرینی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک جگہ تمثیلات "Parables" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

"زندگی کی عمیق ترین صداقتوں کو روزمرہ تمثیلوں کی صورت میں بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیکسپیئر، مولانا روم اور عیسیٰ غالباً اس نادر و نایاب طبّاعی کی واحد مثالیں ہیں۔"(۲)

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر رومیؒ کے نسبتہً مفصل ذکر میں نٹشے سے اس کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے افکار کے اعتبار سے رومیؒ اور نٹشے میں بعد القطبین پایا جاتا ہے مگر ادبیات اور فکر کی تاریخ میں اتفاق اور اختلافات کے نکات خاص دلچسپی کے حامل چیز سمجھے جاتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"گہرے فکری اختلافات کے باوجود یہ دو عظیم مفکر شاعر زندگی پر اپنی فکر کے عملی اثرات کے اعتبار سے کامل طور پر مشابہ ہیں۔ نٹشے اپنے ارد گرد نوعِ انسانی کو حالتِ زوال میں دیکھتا تھا۔ اس نے اس زوال کے پس پردہ بر سر عمل قوتوں کو منکشف کیا اور آخر کار اس طرزِ زندگی کو واضح کرنے کی کوشش کی جو ہمارے سیارے کے لیے موزوں تھی۔ اس فکر کا مرکزی نکتہ اس کا یہ قول تھا: یہ اہم نہیں کہ انسان کو کس طرح محفوظ کیا جائے بلکہ یہ امر اہم ہے کہ کس طرح انسان کو اس کی محدودیتوں سے بالاتر لے جایا جائے۔ بے مثال رومی نے مسلم دنیا میں ایک ایسے عہد میں ظہور کیا جب حیات و افکار کو اضمحلال سے دوچار کرنے والے عناصر اور بظاہر پرکشش مگر بہ باطن ضعیف کن ادبیات نے مسلم ایشیا کا کم و بیش سارا خون چوس لیا تھا اور تاتاریوں کے لیے آسان فتح کا

راستہ ہموار کر دیا تھا۔ رومی نٹشے سے حیات کے افلاس، نااہلیت اور معاشرتی ڈھانچے کے زوال کے باب میں کسی طرح بھی کم حساس نہیں تھے۔" (۳)

اقبال اور رومی کے یہاں محض اسلوبِ شعری ہی میں نہیں موضوعات شعری میں بھی کمال مشابہت نظر آتی ہے۔ دونوں کے تصور انسان، تصور حیات اور تصور عشق نیز ان تصورات کے تحت ذیلی تصورات میں حیرت انگیز مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ اقبال نے رومیؒ میں مرید و مراد کے باہمی عقیدت مندانہ اور احترامی رشتے کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ اقبال نے رومی میں اہنی شخصیت کو گم کر دیا ہو۔ رومیؒ سے اقبال کی فیضان اندوزی کسی اندھے بہرے مقلد کی نہیں، بلکہ ایک وسیع النظر اور کمال تربیت یافتہ، پختہ فکر دانشور کی ایک دوسرے بے نظیر متکلم، عالم اور حامل حکمت و حرارت اور عرفان الٰہی کی فیض یافتہ شخصیت سے اثر پذیری ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں بے مثال مفکر شاعر کہے جاسکتے ہیں اور دونوں کا انتہائی چشمہ فیض اندوزی، الہام ربانی ہے۔

معروف دانشور اے ایچ کمالی نے "فکر اسلامی ورثہ" کے زیر عنوان رومی کے تصور عشق پر بحث کرتے ہوئے یہ نقطہ اٹھایا ہے کہ رومیؒ کے لیے عشق اخلاقی طرزِ عمل کے ایک اصول کا درجہ رکھتا تھا۔ عرفان کے ایک اصول کی حیثیت سے اس کا انجام سمندر کی وسعتوں میں گم ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔ رومی کے نزدیک محبت کا تجربہ سالک کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور وہ اپنے اندر مطلوب و محبوب کی صفات کو پیدا کرلیتا ہے اور نہ صرف شاعری میں بلکہ اقبال نے اپنے اہم ترین نثری کارنامے "جدید تشکیل الٰہیات اسلامیہ" میں بھی کئی جگہ رومی کا ذکر کمال شیفتگی سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے تیسرے، چوتھے اور ساتویں خطبے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ چوتھے خطبے میں اقبال نے عصر جدید کے آشوب و بحران کے حل کے لیے ایک رومی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ کہتے ہیں:

"The world of today needs a Rumi to create an attitude of hope and to kindle the fire of enthusiasm for life." (4)

کیا یورپ اور خصوصاً امریکہ میں رومیؒ کی روزافزوں اور حیرت انگیز مقبولیت کا سبب یہی تو نہیں کہ روحانی طور پر بنجر اور باطنی طور پر کھوکھلی تہذیب کے فرزندوں کو رومیؒ کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ دکھائی دیا ہے جو ان باطن میں آتشِ شوق کی چنگاری روشن کر سکتا ہے کہ یہی کام روشن ضمیر حضرات تہذیبوں کے بجھتے چراغوں کو سہارا دینے کے لیے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔ نظریہ خودی، عصری علوم سے واقفیت، ارتقائے حیات، عظمتِ آدمیت، عشق اور عقل کا موازنہ، مسئلہ جبر و قدر اور حاجات کے حوالہ سے جو مماثلات اقبال اور رومی کے ہاں ملتی ہیں وہ سب کی سب اپنے تئیں ایک مشعل کا کام انجام دیتی ہیں اور آج کے دور کے انسان کے لیے رہنما کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ آج کا انسان اگر انہیں مماثلات کو اپنا رہبر تسلیم کرلے تو آج کے عصری تقاضے بغیر کسی حیل و حجت کے پورے ہونا شروع ہو جائیں گے اور آج کے انسان کے کئی مسائل کا حل بھی مل جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کی فکری زاویے اپنے اندر مابعد نو آبادیاتی، الہیاتی، زمینی، معروضی جہات کو سموئے ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں اقبال کی فکر کو عصری تقاضوں کے ضمن پرکھنے کا سوال بالکل بھی بے جا نہیں ہے کیوں کہ دورِ قدیم اور جدید کے معاشرے کے ٹھوس حقائق جہاں اقبال کی شخصیت کو ایک نادر اتصال اور امتزاج کی شکل عطا کرتے ہیں وہاں یہی ہنگامی اور ابدی اتصال فکرِ اقبال کو لازوال زمانی اور عصری جہات بھی عطا کرتا ہے۔ فکرِ اقبال کا دائرہ کار معراج اور مراجعت کے امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کے ہاں ابدیت کی روشنی میں جدید عصری

تقاضوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی فکر کے تخیل کو بروئے کار لاتے ہوئے کئی زاویوں سے مختلف نتائج مرتب کر کے اپنے تخلیقات میں پیش کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال کا نظامِ فکر

حضرتِ انسان سے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے تب سے وہ اسی فکر میں سرگرداں ہے کہ اپنے آغاز و انجام اور کائنات سے اپنے رشتوں کا معلوم کر سکے۔ کائنات اور تخلیقِ کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھا سکے۔ فکرِ اقبال کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا، خودی (انسان کی ذات) اور کائنات مل کر ایک ایسی مثلث بناتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے اکمل ترین، انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس اکمل ترین ذات کا پرتو اور نائب جب کہ یہ کائنات اسی اکمل ترین ذات کی تخلیق جس میں حضرتِ انسان اپنے نائب ہونے کا حق ادا کر رہا ہے اور کائنات میں تخلیقی عمل ازل تا ابد جاری و ساری ہے۔ سید کرنل نواب عالم بارہوی اس حوالہ سے رقم طراز ہیں:

> "شاید اگر انسان کو کائنات کی رنگینیاں پریشان نہ کرتیں اور فطرت کی قوتیں اس کے سامنے مسائل کے انبار نہ لگاتیں اور شعور و علمِ انسانی اسے فکر و غور اور تجسس و تحقیق پر نہ اکساتا تو انسان کبھی بھی خدا کی تلاش میں نہ نکلتا اور روحانی وجدان کی ضرورت محسوس نہ کرتا لیکن مشکل یہی تو ہے کہ بغیر خدا سے رابطہ قائم کیے وہ اس کائنات سے نہ ہم آہنگ ہو سکتا ہے نہ مربوط، اسے یہ تکون مکمل کرنے کے لیے اس بازو کو قہراً و جبراً اپنے نظامِ تکوین کا جزوِ لاینفک بنانا ہی پڑتا ہے۔"(۵)

آج جدید دور کے عالمی منظر نامے پر نظر دوڑانے سے جن الم ناک حقائق سے پردہ اٹھتا ہے وہ اس حقیقت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہیں کہ موجودہ دور کے انسانی تہذیبی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور سیاسی و سماجی صورت اپنے اندر ایک کرب کو سموئے ہوئے ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت **ظَهَرَ الفَسَادُ فِي البَرِّ وَ البَحرِ** آج کے دور کے تہذیبی و سیاسی، معاشی و اقتصادی، معاشرتی و سیاسی اور علمی و فکری ابتری اور غلامانہ سوچ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ 11/9 کے واقعات کے بعد پوری نوعِ انسانی خاص مسلمانوں کا وجود داؤ پر لگ چکا ہے۔ ایک نئے نظام نے جنم لیا ہے جس کی پشت پر پورا مغرب اور خاص امریکہ بہادر غیر معمولی احساسِ برتری کے ساتھ پورے زور و شور کے ساتھ کھڑا ہے اور نئی مگر خاموش سرد جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس فکر کو سمجھنے کے لیے امریکی دانشور و نقاد "فوکویاما" کی کتاب "The End of History & the Last Man" کے ساتھ ساتھ "سموئیل پی ہنٹنگٹن" کی کتاب "The Clash of Civilizations and The Remaking of World Order" کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ دونوں ناقدین نے اپنے تئیں لبرل جمہوریت اور تہذیبی و ثقافتی اختلافات کو بنی نوعِ انسان میں تفریق، تقسیم اور تصادم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی بنیاد کے سبب ایک طرف عیسائیت، یہودیت اور دیگر مذاہب کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مسلم دنیا کی ثقافتی تقسیم کا منظر نامہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسی ضمن میں اب معاشی سربراہی لینے کے لیے چین اور امریکہ کے درمیان ایک نئی سرد جنگ کا آغاز بھی پوری دنیا کے لیے ایک نئی صورتِ حال کا پیش خیمہ ہے۔ اس صورتِ حال میں اقبال کی فکر ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی

ہے۔ اقبال کی فکر کے دھاروں کو ان کی نظم "امامت" میں دیکھا جا سکتا ہے جو ان کے مجموعہ "ضربِ کلیم" میں شامل ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے (6)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اپنے فکری تخیلات کے سبب اپنے دور کے معاشرے سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اُس کا ایک سبب فکری اور معنوی اعتبار سے وہ روح کش نظریات ہیں جو اقبال کے زمانہ میں بھی نوعِ انسانی میں فساد کا سبب تھے اور آج کے اس جدید دور میں بھی ارضِ پاک کو سلگتی آگ کے شعلوں والا دوزخ بنائے ہوئے ہیں۔ علّامہ اقبال کے شعری اور نثری تخلیقات کا ماحاصل آزادی، حُرّیتِ اظہار اور ارضِ پاک سے نئی آدمیت کا ظہور ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنی فکر کے طفیل ذہنی و روحانی، فکری و فنی، سیاسی و نفسیاتی، معاشی و معاشرتی اور اقتصادی سطح پر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس کے سبب عالمِ انسان افلاک کی منازل بھی طے کرتے ہوئے اُس درجے پر فائز ہو جائے جو واقعی اس کے خلیفۃ الارض ہونے کی دلیل بنے۔

فکرِ اقبال کا ایک انتہائی دلچسپ پہلو انسان کی تخلیق اور رب العالمین سے اس کا تعلق ہونا ہے۔ اقبال کا انسان مسلسل پیچ و تاب کھاتا ہوا، متجسس، بے تاب، بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اقبال انسان کو رب العالمین کی طرح تخلیقی فعال سمجھتے ہیں اور اس کی خودی کا مقصد انکشافِ ذات کے ساتھ ساتھ جوہرِ خودی کی نمو ہے۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ مستقل تحقیق، ایجاد اور تخلیق کے عمل میں خود کو مشغول رکھے۔ اقبالؒ کی فکر کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کی فکر کا مرکز تعمیرِ آدمیت ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان کا تعلق اقبالؒ کے فلسفہ خودی اور فلسفہ حیات کا مرکزی نکتہ ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرتِ انسان اس نظام کائنات میں اہم ترین ہستی ہے اور ساری کائنات کو اس کے تابع بنا دیا گیا ہے۔

چناں با ذات حق خلوت گزینی
ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گزر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نُورش
چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز
عیاں خود را نہاں اُو را برافروز (7)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے علامہ اقبالؒ کی فکر کے حوالہ سے جو رائے دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھا تھا۔ اسی بنا علامہ اقبال نے اپنے عقائد کی بنیاد تمام تر قرآن پر رکھی۔ چناں چہ انہوں نے ایک موقع پر خود فرمایا: "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں۔"(۸)

اقبالؒ کا اپنا شعر ہی اس کی تشریح کے لیے کافی ہے ملاحظہ ہو:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں قرآن!　(۹)

اقبال کا نظریہ خودی اور آج کا نوجوان

اقبال کے تصور خودی کو ان کے تمام نظریات میں کلیدی حیثیت حاصل ہے بل کہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کے افکار کی بلند و بالا عمارت کی بنیاد ہی اس نظریے پر رکھی گئی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ ان کے افکار کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ واضح نظر آتا ہے کہ ان کے تمام معرکۃ الآراء نظریات جن میں انسان کامل، عقل و عشق، خیر و شر، جبر و قدر، وطنیت و قومیت، سیاست و جمہوریت اور تعلیم و تہذیب کے نظریے شامل ہیں، میں ان کے فلسفہ خودی کی روح براہ راست یا بالواسطہ طور پر جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اقبال کا تصور خودی کوئی ماورائی تخیل نہیں جو صرف ذہنوں میں جگہ حاصل کر سکا ہو اور حقیقی زندگی سے اس کا کوئی دور کا تعلق نہ ہو بل کہ یہ ایک مکمل ضابطہ اور لائحہ عمل ہے جسے انہوں نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مرتب کیا اور اس میں تمام تر مسائل کا حل موجود ہے۔ اس پر عمل پیرا ہو کر وہ نہ صرف موجودہ دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں بل کہ ان کی کھوئی ہوئی عظمت اور شان و شوکت دوبارہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے نظریہ خودی کے مراحل ذیل میں ہیں:

۱۔ عرفان ذات　　۲۔ عرفان آدم　　۳۔ عرفان رب

اقبال کے ہاں خودی کی مسلسل تربیت اور استحکام از حد ضروری ہے۔ اس کا جمود گویا انسانی ذات کے لیے فنا اور موت کا پیغام ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں:

۱۔ اطاعتِ الٰہی　　۲۔ ضبط نفس　　۳۔ نیابتِ الٰہی

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات!
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے(۱۰)

علّامہ اقبالؒ کے ہاں تصورِ زندگی اور تصورِ زمانہ ان کو جہاں ابدیت، حرکت اور رجائیت کی طرف لے جاتا ہے وہاں ان کو اپنے دور کی تہذیبی و فکری صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ اقبالؒ کے ہاں حکیمانہ بصیرت ان کو ایک ایسے مردِ آہن کی حیثیت عطا کرتی ہے جو رنگ، نسل اور علاقائی حدود و قیود سے ماورا ہو کر پوری نوعِ انسانی خاص مسلم طبقہ کی حالتِ زار کا نوحہ پیش کرنے کے لیے اپنی تخلیقات کو اس طور مرتب کرتا ہے کہ رہتی دنیا تک اُس کی فکر مشعلِ راہ کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ سامراج سے ان کی شدید نفرت کو واضح کرتی ہے۔

اقبال کا تصورِ شاہین

شاہین اقبالؒ کی پسندیدہ علامت ہے اور ان کے خیال میں شاہین وہ واحد پرندہ ہے جو انتہائی تیز رفتار، جمیل اور جلال والا ہے۔ شاہین کی پرواز کی وسعت کی صلاحیت اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے اس کو خاص علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کے ہر نوجوان کو شاہین کی صفات سے متّصِف کرنے کے خواہاں ہیں جو فلک کی وسعتوں کو چیرتے ہوئے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک اپنی بادشاہت قائم کرے اور جہانِ تازہ کی تلاش کرتے ہوئے اپنے افکارِ تازہ کو ہر سو پیش کرے۔ ان سارے خیالات کو حقیقت میں بدلنا اقبالؒ کا خواب تھا وجہ اس کی یہ تھی کہ انہیں نوجوانوں سے نسبتاً توقعات بھی زیادہ تھیں۔ اقبالؒ نے اپنے شاہین کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں:

آزادی	آشیانہ نہ بنانا	بلند پروازی	تیز نگاہی	تجسس
خلوت پسند	یسخت کوشی	غیرت وخُودداری	قوت وتوانائی	فقر واستغنا

شامل ہیں۔ اقبال شاہین کے علامتی استعمال سے مسلم نوجوانوں میں عزت و وقار اور سربلندی سے زندگی گزارنے کے لیے شاہین کی صفات کو پیدا کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ نوجوان نسل اگر زمین کی پستیوں سے نکل کر بلندیوں اور وسعتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بخوبی اپنے حقوق و فرائض کو سمجھنا ضروری ہو گا۔ عزم و ہمت کی مثال بننے کے ساتھ ساتھ ہر مصیبت، مشکل اور پریشانی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہو گا اس انداز میں کہ وہ کفر و الحاد کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں تاکہ خود پستیوں سے نکال کر آسمان کی وسعتوں کی طرف لے جا سکیں۔

جوانوں کو مری آہِ سَحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے(۱۱)
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قُوت کے سامنے افلاک(۱۲)

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کی ان کمزوریوں کی نشان دہی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقتوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے بڑی دور اندیشی اور خداداد بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ عنقریب اسلام کی سربلندی حاصل ہو جائے گی۔ اقبال کے ہاں اجتہادی تصورات ان کی فکری جہات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے نوعِ انسانی کے بڑے بڑے مسائل کو تمام تر جہات کے ساتھ بڑی بے باکی، صداقت، خلوص اور بلند اخلاق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ معاشرتی اور مثالی معاشرے کے قیام کے لیے

ٹھوس اور مضبوط دلائل دیے ہیں۔ ایسے سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی اصول دیے ہیں جو سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں تغیر و تبدل کی وضاحت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستحکم اصولوں اور تغیرات کی ہم آہنگی کو ہر دور اور زمانہ میں بر قرار رکھنے کے لیے ان کے تصور اجتہاد کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کو ان کے خطبہ " The Principal of movement in structure of Islam" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ کے ہاں اجتہاد کے ماخذ میں قرآن مجید، حدیث شریف، اجماع صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وامت اور قیاس پر منحصر ہے اور یہی چاروں اصول فقہ کے بھی ہیں جو اسلام میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اقبال کے دیگر تصورات میں خیر و شر، زمان و مکان، تقدیر، جبر و قدر اور فلسفہ تعلیم کے ساتھ ساتھ مردِ مومن / مردِ کامل کا نظریہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ کی فکری و تخلیقی شخصیت کئی جہات پر مشتمل ہے۔ فلسفہ، شاعری، الہیاتِ اسلامی، معیشت، معاشرت، تہذیب و تمدن، ثقافت و سماج، فکر و فن، زبان و ادب سب کچھ اپنے تخلیقی، فکری، فنی اور جمالیاتی ہمہ گیری کی بنا پر اقبالؒ ایک محبوب ہستی بن کر ابھرے ہیں۔ اردو ادب میں شاید ہی کسی اور ادیب پر اتنا لکھا گیا ہو جتنا اقبال پر لکھا گیا ہے۔ اقبال اپنی فکر اور پیغام کے حوالہ سے بیسویں صدی کی منفرد اور نمایاں شخصیت شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات اسلام کے لازوال اصولوں پر مبنی ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی فکری، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، نفسیاتی اور علمی رجحانات کو تبدیل میں نمایاں ترین کردار ادا کیا ہے۔ فکرِ اسلامی کے جمود کو توڑنے اور اس کی تشکیلِ جدید میں اپنا خاصہ حصہ ڈالا ہے۔

اقبالؒ کو مشرق و مغرب کے علوم پر مکمل عبور ہونے کے سبب ماضی و حال اور مستقبل کا گہرا شعور تھا۔ حالات کی جبریت نت نئے انقلابات کو جنم دے رہی تھی۔ اسی زمانہ میں انقلابِ روس کو کروٹ لیتے کو اقبالؒ اپنی شعور کی آنکھ سے دیکھ چکے تھے۔ انہی انقلابات کے تناظر میں اقبال یہ محسوس کر چکے تھے کہ مسلمانانِ عالم کو بھی اپنی تقدیر کی تشکیلِ نو کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اسی فریضہ کو نبھانے کے لیے اقبالؒ نے اپنی شاعری کی مدد سے ملّتِ اسلامیہ کے تن بدن میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اقبالؒ نے بڑے واشگاف الفاظ میں اسلام کا پیغام اپنے قارئین تک بہم پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام مشرق و مغرب کی قیود سے آزاد اور بے نیاز تھا اور اس پیغام کا اصل مخاطب وہ آفاقی انسان ہے جس میں خود کئی آفاق گم ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ تخلیقی فکر و نظر کا تعلق ماضی سے نہیں بل کہ مستقبل میں پنہاں ہے۔

اقبال ہمیں ماضی میں ضرور جھانکنے دیتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ہمیں مستقبل کے حوالہ سے آگے بڑھنے کی تلقین بھی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ماضی کو حال کی آنکھوں سے مستقبل کی روشنی میں دیکھتے محسوس ہوتے ہیں۔ در اصل وہ زندگی کو مسائل کے بطن کی گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں اور خود کربِ تخلیق سے گزر کر نئی مسلم تہذیب کی جہت مقرر کرتے ہوئے مسلمانانِ عالم کو نئی راہوں سے روشناس کراتے ہیں۔ اقبالؒ ہماری دنیائے ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے کہ جس کی کرنیں چار دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ ایک بے مثل شاعر، ادیب، عالمِ دین، مفکر، فلاسفر، سیاست دان، پیغام بر، حکیم الامّت اور ایسے جامع کمالات اور صفات والے انسان تھے جو " آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہیں۔ آج مشرق و مغرب میں ان کے حکیمانہ اور بصیرت سے بھرپور افکار پھیلے ہوئے ہیں اور انھی افکار کو ہر خطہ زمین میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی بصیرت افروز افکار کے ذریعے قوم کی روح و قلب میں انقلاب آفریں روح پھونک دی۔ غرض وہ قوم کے ایسے محسن ہیں جنھوں نے اپنے افکار کے ذریعے ملّتِ خوابیدہ کو بیدار کیا۔

اقبال کا شاہین محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے بل کہ اس جانور میں اسلامی فقر کی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو آج کے نوجوان میں پایا جانا ضروری ہیں۔ خود داری، غیرت مندی بلند پروازی، خلوت پسندی، سخت کوشی، قوت و توانائی، حریت اور تجسس اس کی اہم ترین خوبیاں ہیں۔ مزید براں اقبال کا شاہیں ان تمام صفات کا مالک ہے جو ایک مردِ مومن یا مردِ درویش میں موجود ہونی چاہیں۔ اقبال اپنے اس فکری نظریہ کی بدولت آج کے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر آج کے نوجوان کو مخاطب کرتے ہیں کہ اگر آج کا نوجوان اپنے اس دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اقبال کے نظریہ شاہین کو اپنی فکر کے زاویے میں داخل کر لے تو نہ صرف وہ آج کے عصری تقاضوں سے نبرد آزما ہو سکتا ہے بلکہ ان پر فتح کا پرچم بھی لہرا کر اپنی بشری فوقیت کو ثابت کر سکتا ہے اور آج کے بنیادی مسئلہ فاشزم یعنی سرمایہ دارانہ نظام کو مات دے سکتا ہے۔

اقبال کا تصور مردِ مومن

اقبال کے افکار میں مردِ مومن یا مردِ کامل کا ذکر جابہ جا ملتا ہے اس لیے اقبال کے ہاں مردِ حق، بندہ آفاقی، بندہ مومن، مردِ بزرگ، مومن، جاں باز، مجاہد، مسلم، قلندر، مردِ خدا، مردِ مسلماں، مردانِ غازی اور پر اسرار بندے ایسے بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ دراصل یہ اس ایک ہستی کے نام ہیں جو اقبال کے تصور خودی کا مثال پیکر ہے۔ اسلامی تصور کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس مردِ مومن اور مردِ کامل کے اندر اپنی روح میں سے روح پھونکی اور اسے اشیاء کے نام سکھا کر علم کی دولت سے مالا مال کر دیا اور انسان کو فرشتوں سے بھی بلند مقام دے کر اشرف المخلوقات کے عہدے پر فائز کیا۔ حدیث شریف کے مفہوم کے مطابق انسان مسلسل اطاعت و عبادت سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخر میں انسان اسی ذاتِ جلیلہ کے اوصاف کا آئینہ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ آنکھ خدا کی آنکھ بن جاتی ہے اور جس زبان سے وہ کلام کرتا ہے وہ خدائے ذوالجلال کی زبان بن جاتی ہے اور جس ہاتھ سے وہ مردِ کامل کام کرتا ہے خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور جس پاؤں سے چل کر وہ دنیا کے کام کرتا ہے رب العالمین وہ پاؤں بن جاتا ہے۔

غرض انسانِ کامل ان صفات سے متصف ہو جاتا ہے جو اس مالک الملک کی صفات ہیں اور یہ درجہ ہی انسان کو احکم الحاکمین کے نائب یعنی خلیفہ کی مسند پر فائز کرتا ہے۔ مردِ مومن خودی کامل کا نتیجہ اور کامل نمونہ ہے اور اسی نمونے کے سبب مردِ مومن خلافتِ الٰہیہ کے منصب پر فائز ہوا ہے اور باقی منزلوں سے گزر چکا ہے۔ دوسرا مردِ مومن کے اندر پختہ یقین اسے خدا، کائنات اور اپنی ذات کا عرفان عطا کر گیا ہے اور اس کے اندر کسی قسم کی تشکیک باقی نہیں رہتی۔ یہی پختہ یقین مردِ مومن کے اندر بے باکی اور بے خوفی پیدا کر دیتا ہے اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہتا اور اس کا دل جھوٹے وہموں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن تجدیدِ حیات، جمال و جلال، جہد و عمل، عشق، حق گوئی، بے باکی اور فقر جیسی صفات کا مالک ہے۔ وہ دنیاوی مال و دولت سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس میں جذبہ شاہین اور شاہانہ شان و شوکت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مادی دنیا کی تسخیر ممکن ہو جاتی ہے اور دنیا کی تمام قوتیں اور سلطنتیں اس کے پاؤں کی خاک بن جاتی ہیں۔ اقبال اپنی نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں آج کے دور کے نوجوان کو خطاب کرتے ہوئے بتانا چاہتے ہیں کہ اگر مردِ مومن بننا ہے اور خودی کو اپنے اندر جذب کرنا ہے اور آج کے عصری تقاضوں کو حل تلاش کرنا ہے تو ضرور اپنے آباؤ و اجداد کی تاریخ پر نظر دوڑانا ہو گی اگر آباء نے اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں پیدا کر کے دنیا پر حکمرانی کی

تو بعید نہیں کہ اگر آج کا نوجوان بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے استقامت اختیار کر لے تو آج بھی وہ دنیا کا فاتح ہو سکتا ہے اور پوری دنیا اس کے پاؤں کی زنجیر بننے کی بجائے اس کے پاؤں کی دھول ہو سکتی ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں تلے تاجِ سرِ دارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیّارا(۱۳)

ڈاکٹر علّامہ محمد اقبالؒ کے ہاں روح کی حدّت اور تیقن کی روشنی حد درجہ ملتی ہے۔ اُن کے شعری اور نثری سرمائے کے ساتھ ساتھ ان کی عملی کاوشوں کا منتہا اور منشا ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جو آفاقی اور ابدی نظریہ انسانیت کا حامل ہو۔ ایسا معاشرہ جو رنگ، نسل، ذات پات اور اونچ نیچ طبقات جیسے امتیازات سے مبرّا ہو، جس میں بقائے باہمی اور احترامِ انسانیت موجود ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار اور قربانی کا جذبہ کار فرما ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جو ہر قسم کی غرض، لالچ، تکبر، بے ایمانی سے پاک ہو اور اس کی بنیاد صرف اور صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور دینِ محمدی ﷺ کی پیروی میں انسانیت کی تشکیل ہو۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اس دنیا میں مادہ پرستی، معاشی استحصال، معاشرتی ناہمواری اور دیگر فکری و فنی اور سماجی و روحانی مفسدات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک اقبالؒ کی فکری و معنوی جذبہ کی جاذبیت حقیقی اور معنوی ہر دو اعتبار سے برقرار رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کو اب ایک صدی ہونے کے قریب ہے لیکن پھر بھی ان کا کلام آج بھی اُسی شد و مد کے پڑھا، سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے جو ان کے تصورِ مردِ مومن، تصورِ خودی، تصورِ تعلیم، تصورِ جمہوریت و ملوکیت، تصورِ عقل و عشق اور تصورِ وطنیت کی ذیل میں آج بھی دنیائے ادب میں عروج حاصل کیے ہوئے ہے۔ مزید برآں اُن کے آفاقی خیالات کے ضمن میں حاکمِ اعلیٰ کا جو تصور کار فرما ہے وہ یقینی طور پر ہر دور کے عصری تقاضوں کی تکمیل کے لیے از حد ضروری ہے۔

اقبال اور آج کے عصری تقاضوں میں نظریہ پس نو آبادیت

اقبال کے نظریہ خودی کو پڑھنے سے پہلے بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ اقبال کا یہ نظریہ دراصل "نو آبادیاتی نظام" کے خلاف ایک رد عمل ہے کیوں کہ انسان کی خودی اسے آزاد فضاؤں میں سانس لینے اور صرف ایک ذات خدائے واحد کا غلام بناتی ہے۔ درس خودی بھی اسی سلسلہ کی کڑی معلوم ہوتی ہے جس کے سبب انسان خلاصہ کائنات ہے اور کائنات کی تخلیق میں بنیادی کردار اسی انسان کا ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ جو انسان اپنی ذات کو پہچان گیا گویا اس نے کائنات کے خالق کو پالیا۔ اللہ پاک اور فرشتوں کا مکالمہ، انسان کا فرشتوں پر برتری لینا، مسجود ملائک ہونا یہ سب انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر دال ہیں۔ پھر انسان اپنی خودی بیچ کر کسی اور کا غلام بن جائے اور اپنی خودی پر کسی اور کو فوقیت دے تو پھر اقبال کا پیغام اس "بانگ" کی مانند ہے جسے سن کر ہر ذی شعور اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں نو آبادیاتی نظام کے تہذیبی و ثقافتی

علمی و فکری، نفسیاتی، عمرانیاتی اور اقتصادی اثرات پر گہری چوٹ ملتی ہے، خودی کے تجزیاتی فہم سے نو آبادیتی نظام کی جھلک صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ قرآن پاک بھی اس پر دلیل ہے:**ومن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ(القرآن) (۱۴)**ترجمہ: جس نے بھی کفر و شرک کا انکار کیا وہی مومن ہے۔ لہٰذا اقبال کے نزدیک بھی انسان پر یہ حقیقت اس وقت منکشف ہو گی جب وہ اپنی خودی کا ادراک کرے گا۔ خودی دراصل آزادی کا راستہ ہے۔ احساس خودی کے فقدان کے سبب قومیں غلامی اور غلامانہ نفسیات کا شکار ہو جاتی ہیں جو ان قوموں کی تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔

ایمان کی کمزوری دراصل انسان کو غلامی پر مجبور کرتی ہے اور اقبال کا نظریہ خودی اس پیغام کو عام کرنے میں ایک اعلان کے مترادف ہے۔ اقبال اس پیغام اور اعلان سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ اقبال نو آبادیاتی نظام اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی حاکمیت، غلامی اور غلام پرور ذہن سازی کے حیلے بہانوں سے بھی خوب واقف تھے یہی وہ حیلے بہانے ہیں جو مختلف اقوام کو غلامی پر رضامند رکھنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔

جمہوریت، اخلاقیات، معاشرت، انسانیت اور انصاف کے نام پر ظلم و جبر، استحصال اور مکر و فریب ہی دراصل آمریت، ملوکیت اور نو آبادیت کا اصل چہرہ ہیں۔ اقبال کے مطابق نو آبادیاتی نظام اور نو آبادکار اپنے معاشی، اقتصادی، سیاسی فکری اور ثقافتی مفادات کے حصول کے لیے ابلیسی ضابطہ اخلاق ترتیب دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملوکیت، شہنشاہیت، غیر ملکی طرز حکمرانی، مقامی باشندوں اور نو آبادیوں کے غریب، مفلوک الحال عوام کی شکستہ حالی اور ان مظلوم اور مقہور عوام کی تقدیر کی جبریت پر مہر تصدیق بھی ثبت کرتا ہے۔ یہی ابلیسی ضابطہ اخلاق مقامی آبادی کے باشندوں میں خوئے غلامی کو ترویج دینے اور اسی کو نجات دہندہ تسلیم کرنے اور وقت کے صوفی و ملا سے اسی ملوکیت کے حق میں کلمہ خیر کہلوانے کا سبب بنتا ہے۔

اس سارے کا نتیجہ بالآخر یہی نکلتا ہے کہ مرد حُر کے لیے زندگی وبال بنانے کے ساتھ ساتھ آزادی کے لیے اس کی جدوجہد کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے اور اس سے آزادی جیسی نعمت صلب کر لی جاتی ہے۔ فکر اقبال میں محکوم اقوام خاص ہندوستانی قوم کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف شدید رد عمل ملتا ہے۔ وہ مغرب پرستی کرنے والے افراد سے انتہائی بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دور جب مغربی تہذیب، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، اقتصادی، مذہبی، اخلاقی اور معاشی میدانوں میں دل و دماغ پر چھائے جا رہی تھی اس دور میں اقبال نے مغربی تہذیب کے کم زور پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے اسلامی نظریات فکر کی ترویج اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے اور اسلامی فکر اور عمل کو برتر ثابت کرنے میں اپنے تمام تر اصول و ضوابط اور عملی اور عملی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا فرض ادا کیا۔ اقبال بڑے واضح الفاظ میں پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ ذہنی و فکری طور پر مرعوب طبقہ ہر گز مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی و علمی و عملی فکر کی راہ نمائی کا اہل نہیں ہے۔ یہ اہلیت مسلم معاشرے میں فکری ارتداد کا باعث بن چکی ہے۔ ایسا طبقہ ذاتی مفادات کی خاطر قومی مفادات کا سودا کرتا نظر آتا ہے۔ اسی طبقے کے سبب نو آبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ نو آبادکاری کا یہ نظام ممکن ہی نہ تھا کہ مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر چلتا۔ اقبال بھی لارڈ میکالے کی دی ہوئی تعلیمی پالیسی پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں وہ جاتے تھے کہ غلام جسمانی ہوں یا ذہنی، معاشرتی و معاشی ہوں یا تہذیبی و ثقافتی، علمی غلام ہوں یا عملی فکری ہوں یا مذہبی و اخلاقی، غلام کی ہمیشہ اپنی سوچ نہیں ہوتی وہ ہمیشہ اپنے آقا کی سوچ اور دماغ سے سوچتا ہے۔

ذاتی مفادات کی خاطر استعماری ہتھکنڈوں اور استعماری مفادات کو ترجیح دینے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ملک و ملت کو بھی داؤ لگا دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غلاموں کی بصیرت سے پناہ مانگتے ہیں اور ہمیشہ مرد حُر کی تمنا اور آرزو

کرتے نظر آتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے والے فنون وعلوم اور فکر و لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نظر میں مشکوک ہے اور انھی فنون کے تحت تخلیق شدہ ادب، مصوری سنگ تراشی وغیرہ بھی مشکوک ٹھہرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فنون استعماریت کے نظام کے پروردہ حاکموں، مفکروں، ادیبوں اور دانش وروں کی سوچ کی عکاسی ہوتا ہے۔ اقبال نے غلامی کو ذوق حسن زیبائی سے محرومی کا دوسرا نام دیا ہے۔ ان کے نزدیک غلامی انسان کو کند ذہن بنا کر حسن لطافت سے محروم کر دیتی ہے۔ غلام کے باطن سے سوائے بے دلی، خستہ حالی اور ناتوانی کے کچھ نہیں ملتا۔ علامہ محمد اقبال نے اس سامراجی نظام اور اس کے اثرات خاص مسلمانوں پر ان اثرات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے ان کی سوچ و فکر کو ان کی زبوں حالی کا سبب سمجھا یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلمان ایک تہذیبی وحدت اور اکائی بننے کی دعوت دی تا کہ نو آبادیاتی نظام کے تہذیبی جال سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لی جا سکے۔ ان کی مثنوی "پس چہ باید کرد۔ اے اقوام مشرق" میں نو آبادیاتی نظام کے اثرات پر گہری چوٹ ملتی ہے۔

اس مثنوی میں مسلمان قوم کو ایک قوم کی حیثیت جتلانے کے لیے کئی ایک نکات اور صراحت پیش کرتے ہیں۔ مختلف مشوروں اور نصیحتوں کے سبب دانائے امت اور حکیم الامت ہونے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اپنی تہذیب ہی وہ تہذیب ہے جس نے مغربی تہذیب کے دیے کو روشن کیا۔ مغرب کی خوش حالی، ترقی اور تہذیب و ثقافت کو بنانے میں اسلامی تہذیب ایک معمار اول کا کام انجام دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔ اقبال نو آبادیاتی نظام کے استعماری حربوں کو اپنا ہدف تنقید بناتے ہوئے اپنے فکری نظام کو بروئے لا کر اس استعماریت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا ہے۔ ان کے نزدیک مغربی استعماریت کی یلغار کے سبب منافقت، خود غرضی اور خود فروشی جیسے عناصر نے جنم لیا ہے۔ اس کے برعکس اقبال نے اسلام کو ایک عالمگیر تحریک کے طور پر پیش کیا۔ نو آبادیاتی نظام کے ظلم و ستم پر مستمل استعماری تسلط کے بر خلاف اقبال حقوق انسانی، عظمت بشر، آزادی ضمیر اور حق خود ارادیت کی بنا پر اسلام کو عالم انسانیت کے لیے فلاح، آزادی، خیر خواہی، صلح کل، عالمگیر مساوات پر مبنی تہذیب و ثقافت، کا داعی شمار کیا ہے۔ اسلامی نظام معاشرت اور تہذیب و ثقافت ہی دراصل حقیقت میں انسانیت پر وردہ ہے۔ اسلامی نظام ہی دراصل وہ نظام ہے جس میں رنگ، نسل، ذات، پیشہ اور طبقات کی تقسیم نہ ہے۔

ان کے نزدیک یہی وہ نظام ہے جو نو آبادیاتی و سامراجی نظام کے سامراجی حربوں کے لیے کارگر ہے کیوں کہ نو آبادیاتی و سامراجی نظام کے سامراجی حربوں کے لیے کارگر ہے کیونکہ نو آبادیاتی نظام نے عالم بشریت کی پیٹھ میں انتشار اور محرومی کا خنجر پیوست کر رکھا ہے۔ اقبال نے اسلام کو ہمیشہ ایسی قوت اور روحانی نظام کے طور پر دیکھا اور پر کھا ہے جو انسانیت کو متحد و یکجا کر سکتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی اثرات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ نظام آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ مغرب کی نام نہاد مہذب اقوام اپنے سے پسماندہ اقوام پر ظلم و ستم، جبر و وحشت اور بربریت کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ مغربی خون ریزی کی تازہ ترین مثال 9/11 کے واقعات کے بعد کے حالات ہیں۔ پوری دنیا خاص مسلم ممالک اس کی زد میں ہیں۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق، شام، لبنان، صومالیہ، یمن، روہنگیا مسلمان اور افریقی ممالک اس سفاکی کی زندہ مثال ہیں۔ اقبال اپنی فکری بصیرت کے سبب مغربی استعماریت کی ان سفاکیوں اور خون آشامیوں کو بہت پہلے دیکھ چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "ابلیس کی مجلس شوری" کو بطور مثال کے دیکھا اور پر کھا جا سکتا ہے۔

بر صغیر پاک و ہند میں بل کہ تمام مشرق میں زوال کا بنیادی سبب مغربی استعمار ہی ہے۔ دنیا پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین، کشمیر ہو یا بوسنیا، چیچنیا ہو یا افغانستان، یمن ہو یا شام ایک قیامت

برپا ہے۔ لاکھوں انسان بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارے جارہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جارہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ وخون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدانوں میں خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں۔ علامہ اقبال کی طویل نظمیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء تک کے عرصے میں مختلف اوقات میں لکھی گئیں۔ ان نظموں کی تفہیم میں بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ انظموں کا پس منظر دو سے تین عنوانات کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ دنیائے اسلام خصوصاً سلطنت عثمانیہ، مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور اس کی ابتری۔

۲۔ ذہنی، تہذیبی اور ثقافتی رجحانات کا اثر اور ان عوامل کا مطالعہ جو مسلم دنیا کی سیاست پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوئے۔

۳۔ صہیونی تاریخ کا مختصر جائزہ جس کے سبب مشرق وسطیٰ اور مسلم مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

اسی پس منظر شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ اور خاص طور پر ابلیس کی مجلس شوریٰ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کا فکری جائزہ امت مسلمہ کے نوحے، ابلیس کے کارنامے، اسلامی نظام کی انفرادیت اور ابلیسی نظام (نو آبادیاتی نظام) کے حقیقی خطرات کو نہ صرف پیش کرتی ہے بل کہ بات پوری طرح سمجھا بھی دیتی ہے اور 11/9 کے بعد کی جملہ صورت حال ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہی صورتِ حال آج کے عصری تقاضوں کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے کہ اگر آج ہم نے موجودہ دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی فکر کو اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تابع کرتے ہوئے اقبال کی فکر کو نہ اپنایا تو ہم فکری غلامی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوب جائیں گے اور اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور نام ونشان تک نہ ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اقبال کے فکری نظام سے رہنمائی لی جائے تاکہ مسلم امہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرلے۔

علامہ اقبال کے عصری تقاضے مختلف شعبوں میں متنوع تھے۔ ان کی فکر علم، فن، سیاست، اقتصاد اور دین کے مختلف پہلوؤں پر مبنی تھی۔

۱۔ **فنون و ادب:** اقبال ادب و فن میں بھی فعال رہے اور انہوں نے اردو شاعری میں نیا منہاج قائم کرنے کا پہاڑا اٹھایا۔ ان کے شاعری میں عظیمت، محبت، اور فطرت کی خوبصورتیوں پر زور دیا گیا۔

۲۔ **سیاست:** اقبال کی سیاستی فکر میں مختلف تجاویز شامل ہیں، جو ایک مستقبل کے اسلامی ریاست کی بنا پر مبنی تھیں۔ انہوں نے خود کو ایک مسلمان فکری، اخلاقی، اور سیاسی رہنما مانا، جو اسلامی اصولوں اور قدرتی عدلیہ کی ترویج کرتا ہے۔

۳۔ **تعلیم:** اقبال نے تعلیمی نظام کو مضبوط بنانے اور علمی ترقی کو بڑھانے کے لئے تعلیمی ترتیبات میں بہتری کی طرف رہنمائی کی۔

۴۔ **اقتصاد:** اقبال نے اقتصادی ترقی اور معاشرتی عدلیہ کی ضرورتوں پر بات چیت کی اور اسلامی معاشرتی اصولوں کے تطبیقات پر زور دیا۔

۵۔ **دین:** اقبال کی فکر میں دین ایک اہم حصہ تھا اور انہوں نے اسلامی اصولوں کی روشنی میں معاشرتی، سیاسی اور فکری قضاوٹوں پر غور کیا۔

علامہ اقبال کی فکر کو آج کے عصر میں پرکھنا اہم ہے، اور اس کا تفسیر اور تطبیق کرنا چیلنج آرا ہوتا ہے۔ یہاں کچھ اہم نکات ہیں جو اقبال کی فکر کو آج کے عصری تقاضوں کے مطابق پرکھنے میں مدد فراہم کر سکتی ہیں:

۱۔ **اقبال کی تصویرِ مردانگی :** اقبال نے مردانگی اور شجاعت کی اہمیت پر زور دیا اور اپنی شاعری میں مردانہ جذبات کا اظہار کیا۔ آج کے دور میں، اس فکرِ اقبال کو معاصر معیاروں اور جنسی اخلاقیات کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ **دینی یقین اور معاشرتی چیلنجز :** اقبال نے اسلامی اصولوں اور قیمتوں پر زور دیا۔ آج کے جدید دور میں ہم فکرِ اقبال کے ان اصولوں کو معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی چیلنجز کے ساتھ موازنہ کر کے اپنے معاملات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

۳۔ **علم اور تعلیم :** اقبال نے تعلیمی نظام کو مضبوط بنانے اور علمی ترقی کو بڑھانے کے لئے تعلیمی ترتیبات میں بہتری کی طرف رہنمائی کی۔ ہم بحیثیت مسلمان آج کے دور میں فکرِ اقبال کو بروئے کار لاتے ہوئے تعلیمی چیلنجز اور ٹیکنالوجی کے ساتھ عروج کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں۔

۴۔ **اقتصادی ترقی اور عدلیہ :** اقبال نے اقتصادی ترقی اور عدلیہ کی ضرورتوں پر زور دیا۔ آج کے دور میں ہم معاشرتی اور معاشی اور اقتصادی میدانوں میں فکرِ اقبال سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اعلیٰ اقدار کی حامل قوم کے طور پر سامنے آ سکتے ہیں۔

۵۔ **معاشرتی یکجہتی :** اقبال نے علیحدگی اور مختلفیت کی قدر کو سراہا۔ ہم بھی آج کے دور میں اس تصور کو معاشرتی یکجہتی اور مختلف فرہنگوں کے درمیان امن اور مطابقت کے ذریعے برقرار رکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر علّامہ محمد اقبال کی شاعری کے حوالہ سے بلا مبالغہ یہ کہ سکتے ہیں کہ اس میں اتنی گہرائی ہے جتنی اس عالمِ کائنات میں پائی جاتی ہے۔ کئی ایک شعرا و ادبا نے اپنے اپنے مخصوص نظریات و تصورات کے سبب شہرت کی بلندیوں کو چھوا ہے۔ اقبال کے نظریات میں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں توازن ہی توازن ملتا ہے جو ان کو ایک آفاقی حیثیت دیتا ہے۔ وہ جہاں "ماضی" کی تہوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں وہ وہاں ہمیں اپنے "حال" کو درست رکھنے اور اس "حال" کی بنا پر اپنے "مستقبل" کے حوالے سے بھی پُر امید رہنے پر زور دیتے ہیں۔ پرانی روایات کو ایک نئے انداز میں پیش کرنا اور اس کو عصرِ حاضر کے تقاضوں پر منطبق کرنا اور مستقبل کے حوالے سے پیش قدمی اور پیش گوئی کرنا ہی اقبال کی فکر کو آفاقیت کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے پرانی روایات کا استعمال اس طور کیا ہے کہ ان کا معنی و مفہوم بدل جاتا ہے اور ان کے اندر فکر کی وسعت و گہرائی در آتی ہے۔

اقبالؒ کے ہاں تصورِ عشق، تصورِ زندگی، تصورِ خودی، تصورِ مردِ مومن، تصورِ شاہین، نظریہ تعلیم، نظریہ وطن، نظریہ سماج جو ان کے معاشی و معاشرتی، سیاسی و فکری، ذہنی و نفسیاتی، سماجی و فنی اور علمی و عملی فکر کو کا آئینہ ہیں۔ یہی نظریات و تصورات اقبال کو وہ آفاقی حیثیت عطا کرتے ہیں جن کے سبب آج کے سماج و معاشرہ کے مسائل بھی بہ آسانی حل ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، اقبالؒ اور رومیؒ، مضمون، لاہور، روزنامہ جنگ، ۹۔ نومبر ۲۰۱۷ء، ص:۱۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ نواب عالم بارہوی، کرنل، سید، بصیرت اقبال، راولپنڈی، پیپ بورڈ پرنٹر، ۱۹۹۰ء، ص:۱۰۳

۶۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علّامہ، کلیاتِ اقبال، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱۱

۷۔ حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، مکتبہ دانیال، سن ندارد، ص:۶۳۰

۸۔ عبد السّلام ندوی، مولانا، اقبال کامل، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۶ء، ص:۶۴

۹۔ محمد اقبالؒ، علامہ، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال (اُردو): ضربِ کلیم، الفیصل ناشران، ۲۰۰۶ء، ص:۶۱۲

۱۰۔ محمد اقبالؒ، علامہ، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال (اُردو)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۹ء، ص ۴۱۹

۱۱۔ محمد اقبالؒ، علامہ، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص:۴۵۵

۱۲۔ ایضا، ص:۶۶۹

۱۳۔ محمد اقبالؒ، علامہ، ڈاکٹر، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۱۸۰

۱۴۔ القرآن، سورۃ البقرہ، آیت نمبر 257، پارہ نمبر 3

References in Roman Script:

1. Tahsin Faraqi, Dr. Iqbal and Rumi,(Mazmoon), Lahore,Roznama Jang, 9 November 2017, p. 15

2. Ibid

3. Ibid

4. Ibid

5. Nawab Alam Barhavi, Colonel, Syed, Basirat-e- Iqbal, Rawalpindi, Papboard Printer, 1990, p. 103

6. Muhammad Iqbal, Dr., Allama, Kalyat-i-Iqbal, Ilam and Irfan Publishers, Lahore, 2014, p. 511

7. Hameedullah Hashmi, Professor, Sharh Kalyat Iqbal (Persian), Lahore, Maktaba Daniyal, Sun Darhid, p: 630

8. Abdul Salam Nadvi, Maulana, Iqbal Kamil, Lahore, Al-Faisal Publishers, 2006, p: 64

9. Muhammad Iqbal, Allama, Dr., Kalyat-e-Iqbal (Urdu): Zarb-e-Kaleem, Al-Faisal Publishers, 2006, p. 612

10. Muhammad Iqbal, Allama, Dr., Kaliyat-i-Iqbal (Urdu), Lahore, Sheikh Ghulam Ali and Sons, 1979, p. 419

11. Muhammad Iqbal, Allama, Dr., Kalyat-e-Iqbal (Urdu), p. 455

12. Also, p: 669

13. Muhammad Iqbal, Allama, Dr., Kaliyat-e-Iqbal (Urdu), p. 180

14. Al-Qur'an, Surah Al-Baqarah, Verse No. 257, Paragraph No. 3